© rasailojaraid.com

مولانا محمد حنیف ندوی

قرآن کا تصورِ وحی و تنزیل

۲

وحی کی ضوفشانیوں سے ہماری مراد یہ ہے کہ جب اللہ تعالےٰ کسی شخص کو اس لائق سمجھتا ہے کہ اس کو منصبِ نبوت سے بہرہ مند کرے تو اس کے قلب و ضمیر اور وجدان و فکر کو وحی و تنزیل کے نور سے روشن کر دیتا ہے اور یہ وحی چونکہ زندگی کے بارے میں رشد و ہدایت کی حامل ہوتی ہے اور اُن نکات و معارف کی ترجمانی کرتی ہے جن سے خیر و شر میں فرق و امتیاز کے خطوط ابھرتے ہیں جن سے انسان میں ایک خاص طرزِ عمل اور متعین اسلوب اور فکر کی تخلیق ہوتی ہے اور کردار و بصیرت، اخلاق کے پاکیزہ سانچوں میں ڈھلتے ہیں، اس بنا پر وحی کے اس عمل کو ہم محض میکانکی عمل قرار نہیں دے سکتے کہ جس سے اصلاح، تعمیر اور روحانی ارتقا کا کام نہیں لیا جاتا۔ پیغمبر کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وحی و الہام کی روشنی سے یہ خود بیگانہ رہتا ہے یا اس منصب سے اس کی اپنی زندگی متاثر نہیں ہو پاتی۔ وحی تعلیم ہی نہیں تربیت بھی ہے، ابلاغ ہی نہیں عمل بھی ہے۔ اسی طرح اس کو صرف پیغام ہی نہیں کہہ سکتے، اس کو خیر و جمال کی اداؤں کی دل نوازی عطا کرنے والی ایک ہمہ جہت قوت سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس سے صرف پیغمبر کا نہاں خانۂ عمل ہی مستنیر نہیں ہوتا اس کے ساتھ سیرت اور روزمرہ معمولات کا ہر ہر گوشہ بھی جگمگا اٹھتا ہے، اس سے پیغمبر روشنی اور زندگی کے حقیقی راز سے آشنائی حاصل کرتا ہے اور اس نکتہ سے آگاہ ہوتا ہے کہ ایک کمزور اور ضعیف ناتواں انسان توفیقِ الٰہی کی دستگیری سے کیونکر گناہ، شر اور برائی پر فتح حاصل کر سکتا ہے اور ایک گناہ گار اور مجرم معاشرہ کو کس طرح تقویٰ اور پاکبازی کی راہ پر ڈال دینے کی استطاعت سے بہرہ مند ہوتا ہے۔

ظہورِ وحی پر تفصیلی بحث

اہلِ کتاب کا نقطۂ نظر

یہاں تک تو تصورِ نبوت و وحی کے منطقی لوازم کا تذکرہ تھا اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بحث و نظر کا اسلوب عموم و اجمال لیے ہوئے تھا۔ اب ہمیں قدرے تفصیلات سے تعرض کرنا ہے اور یہ بتانا ہے کہ اہلِ کتاب نے وحی و نبوت کے ظہور کو کس نظریے سے دیکھا اور اسلام نے اس کو کیونکر نکھارا اور واضح کیا۔ اس کے بارے میں کس کس غلط فہمی کو دور کیا اور کیونکر فیوضِ ربوبیت کی روشنی میں اس کو تکمیل و اتمام کی منزلوں تک پہنچایا۔ بات یہ ہے کہ وحی و نبوت کے مسئلہ میں اختلاف کے کئی پہلو ہیں، اور اس کے باوجود یہودی، عیسائی اور مسلمان بظاہر سب انبیا علیہم السلام کی تعلیمات پر ایمان رکھتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ تصورِ نبوت مشترکہ مسلمہ کی حیثیت رکھتا ہے مگر غور کیجیے تو پتہ چلے گا کہ ذوق و ادراک کے فرق، اغراض و مقاصد کی بوقلمونی اور تاریخ کی ستم ظریفیوں نے اس اشتراک میں متعدد رخنے ڈال رکھے ہیں۔

سب سے پہلے انبیا کی فہرست ہی پر نظر ڈالیے اس میں ایسے نام نظر آئیں گے جو اگر ایک گروہ کے ہاں خاصے جانے بوجھے اور معروف ہیں تو دوسرا گروہ ان سے قطعی ناآشنا ہے مثلاً قرآن حکیم نے حضرت ہود، صالح، شعیب اور ذوالکفل کا پیغمبر کی حیثیت سے تذکرہ کیا ہے۔ لیکن اسرائیلی ادبیات میں ان اسماء سے وقوف و شناسائی کا کوئی ثبوت نہیں ملتا

اسی طرح عہد نامہ قدیم میں اشعیا کا نام آتا ہے جس نے ۷۶۹ - ۶۹۳ قبل از مسیح اپنے کو پیغمبر کے نام سے پیش کیا۔ ارمیا کا ذکر ہوا ہے جس نے شاہ یوشیاہ کے عہد میں فرائضِ نبوت انجام دیے اور بارک نامی شخص کی تعلیمات جزوِ کتاب بنی ہیں، جو پہلے ارمیا کا کاتب تھا اور پھر منصبِ نبوت کا اہل سمجھا گیا۔ یہ اور اس نوع کے کئی اور نام ہیں۔ جن سے اسلامی روایات کوئی جان پہچان نہیں رکھتیں ناموں کے اختلاف کے علاوہ جب ہم دیکھتے ہیں کہ نبوت کی حقیقت و جوہر سے متعلق بھی فکر و عقیدہ کا انداز ایک نہیں ہے تو اس سے اس مظہرِ اصلاح و ہدایت کے لیے کوئی مشترکہ اساس، رشتہ اور خصوصیت کا تعین از حد دشوار ہو جاتا ہے۔ اس اختلاف کے حدود کو وسیع تر کرنے میں بنی اسرائیل کی اس بدقسمتی کو بڑا دخل ہے کہ ان کے ہاں شروع ہی سے وحی و نبوت کی پہچان اور تصدیق کے لیے کوئی واضح اور اونچا داخلی یا خارجی پیمانہ پایا نہیں جاتا جس کی وجہ سے اس عظیم منصب کے تقدس کو برقرار رکھنے میں مدد مل سکے۔ ہوا یہ کہ سقوطِ فلسطین کے بعد ان کے نقطۂ نظر میں ایک خوفناک [illegible] اعتقادات کی گرفت سخت ہوئی اور ان کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اپنے قدیم ماحول اور گرد و پیش سے نکل کر دوسری قوموں اور گروہوں کی غلامی کا جوا اپنی گردن میں ڈالنا پڑا تو اس سے ان کے قومی پندار و غرور کو سخت دھچکا لگا اور ان کا سب سے بڑا نصب العین یہ قرار پایا کہ اپنی تمام تر کوششوں کو فلسطین کی بازیابی کے مسئلہ پر مرکوز کر دیں اور اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ نبوت و وحی کے کردار و عظمت کی سمتیں بدل گئیں۔

ابراہیمؑ، داؤدؑ اور حضرت موسیٰؑ ایسی بلند پایہ شخصیتیں اپنی غیر معمولی بصیرت و ادراک، اپنے سیاسی تدبر و شکوہ اور اپنے پیغام کی رفعتوں کی بدولت پیغمبر کی حیثیت سے منظرِ عام پر آئیں تو اب ایسے لوگوں کو بھی اقلیم نبوت میں در آنے کا موقعہ ملا جن کا کارنامہ اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انھوں نے اسرائیل کے قومی پندار کو اجاگر کیا، حادثۂ فلسطین پر نوحے ترتیب دیے اور فلسطین کے اقتدار کو بحال کرنے کی پیش گوئیاں کیں۔ فلسطین کی شکست اور اجنبی اقتدار و تسلط کے مسئلہ نے یہودیوں کو اس درجہ دیوانہ کر دیا کہ یہ مذہب کی روح کو بالکل فراموش کر بیٹھے اور مخالفین کے خلاف معاندانہ جذبات نے ان سے دینی بصیرت کو اس حد تک چھین لیا کہ جس نے بھی ان کی قومیت کو ابھارا اور فتح و نصرت کے وعدوں کا اعادہ کیا، فلسطین پر دوبارہ قبضہ کی پیش گوئی کی، اس کو بغیر سوچے سمجھے، نبوت کی مسند پر بٹھا دیا گیا، چاہے اس کے نوحوں، نعروں اور وعدوں میں کوئی جان نہ ہو، کوئی روحانی پیغام نہ ہو اور کسی معاشرتی مسئلہ کا حل نہ پایا جائے۔ یہی نہیں چاہے اس کے کردار و عمل کے دامن پر فسق و فجور کے شرمناک چھینٹے نمایاں ہوں۔ یہودیوں میں یہ بیماری یہاں تک بڑھی کہ انبیا کی فہرست میں چار سو حضرات ایسے پائے گئے جن کی پیش گوئیاں پوری نہ ہوئیں اور اس بنا پر انھیں جھوٹے نبی کے نام سے پکارا گیا۔

نبوت کے اس غلط تصور سے دو واضح نقصان پہنچے۔ ایک طرف تو اللہ تعالیٰ سے مکالمہ و مخاطبہ کا یہ اسلوب و منہاج بدنام ہوا اور نبوت، وحی و تنزیل کی بلندیوں سے گر کر کہانت کی سطحوں تک آپہنچی۔ دوسرے یہودیت ایک عالمگیر اور روحانی و اخلاقی دعوت و پیغام ہونے کے بجائے تنگ نظرانہ قومیت کی علمبردار بن گئی اور لطف یہ ہے کہ یہودی متکلمین اور حکما کی کوششوں کے باوجود آج بھی مذاہبِ عالم کی برادری میں اس کا شمار ایک ایسے مذہب ہی کی حیثیت سے ہوتا ہے جس کی حدود نسل اور جغرافیہ کے تقاضوں سے آگے نہیں بڑھ پائیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نبوت کی اس روایت سے کلیسا کا انحراف

غالباً تصور کی اس پستی کا یہ ردعمل تھا کہ کلیسا نے مسیح کو خدا یا لاہوت کے ایک اقنوم کی شکل میں پیش کیا۔ اس نے جب دیکھا کہ یہودی روایات میں نبوت کا منصب حد درجہ پستی لیے ہوئے ہے اسے یہ شایانِ شان نہ معلوم ہوا کہ وہ اپنے محبوب پیر و مرشد کو پیغمبر کے روپ میں دکھائے۔ اس نے اس طرح ہزاروں برس کی اس رچی رچی روایت سے انحراف اختیار کیا۔ اول اول اس تصور کی تخم ریزی یوحنا کی انجیل نے کی پال نے غلو کے رنگ میں اسے فلسفہ کا رنگ دیا اور کلیسا نے اس مصرع طرح پر تثلیث کی پوری غزل کہہ دی۔ اور کہا کہ جب خداوند خدا نے دیکھا کہ اس مظہرِ خاص سے جسے منصبِ نبوت سے تعبیر کیا جاتا ہے انسان کی اصلاح و تکمیل کے تقاضے پورے نہیں ہو پاتے۔ یعنی گلستانِ انسانیت کی دیکھ بھال کا کام پوری طرح نہیں ہو پاتا تو خداوند مسیح کی صورت میں جلوہ گر ہوا تاکہ اس گلستان کی خود حفاظت و نگرانی کر سکے۔

یہ انجیل کے رنگ میں ایک تمثیل اور پیرایہ بیان ہے دوسرے لفظوں میں اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ پیغمبر بھیجنے کی جو رسم ہزاروں برس سے دنیا کی ہدایت و رہنمائی کی خاطر چلی آ رہی تھی نتائج کے اعتبار سے ناکام ثابت ہوئی۔ اس لیے اب اسے نئے تجربے کی ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ ذاتِ گرامی جس نے پیغمبر اور نبی بھیجے تھے بہ نفس نفیس انسان کے روپ میں خود دنیا میں آئے اور انسانی مصائب و آلام کا مداوا کرے۔

بحث و تحقیق کے اس موڑ پر ہم یہ سوال پوچھے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتے کہ کیا اس عجیب و غریب تجربہ کی ناکامی کا اللہ تعالیٰ کو پہلے علم نہ تھا اور کیا اظہارِ ذات کے اس تجربہ سے انسان کے شخصی و اجتماعی آلام کا قطعی خاتمہ ہو گیا ہے اور انسان نے تمام انواع کے دکھ درد سے نجات پا لی ہے۔ کلیسا کے اس تصور کو اظہارِ ذات (SELF ENCLOSURE) یا تجسیم (INCARNATION) کے الفاظ سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں اور یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ان کے نقطہ نظر سے لاہوت، تین اقانیم پر مشتمل ایک حقیقت کا نام ہے جو باپ بیٹا اور روح القدس کے نام سے مشہور ہیں اور ان میں رابطہ و تعلق کی نوعیت کچھ اس طرح ہے کہ تین ہوتے ہوئے بھی ایک ہیں اور ایک ہوتے ہوئے بھی تین ہیں۔ ہم تثلیث کی منطق کو چیلنج کیے بغیر یہ کہیں گے کہ عقائد کا یہ اسلوب کلیسا کے حلقوں میں تو بلاشبہ سند قبول حاصل کر سکتا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے کہ یہاں اس کے علاوہ اور بھی متعدد ایسی انوکھی باتیں ہیں جنھیں باور کیا جاتا ہے مگر جہاں تک مسیح کے ان مخاطبین اولین کا تعلق ہے جن کی اصلاح و ہدایت کے لیے یہ مبعوث ہوئے تھے ان میں اتنی استعداد ہرگز نہ تھی کہ وہ اس مابعد الطبیعی گورکھ دھندے کو سمجھ سکیں یہی نہیں آج کا پختہ اور سائنسی شعور و ادراک بھی اس گورکھ دھندے کو ماننے کے لیے تیار نہیں یہی وجہ ہے کہ اس دور کے عیسائی دانش وروں نے اس کی ایسی توجیہات پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو قابلِ فہم ہوں۔ ایل ہاڈگاسن (L. Hodgson) کا کہنا ہے کہ مسیح کی تجسیم یا الوہیت کے پیکر میں ظہور کی تین صورتیں عقل و خرد کی گرفت میں آسکتی ہیں۔

۱۔ یہ کہ انسان نے اللہ کے علم کل میں مسلسل مشارکت کی ہو۔ تعبیر کے اس انداز کو اختیار کرنے میں یہ احتمال پنہاں ہے کہ شاید اسکو عیسائیوں کا کوئی بھی مدرسۂ فکر قبول نہ کر سکے کیونکہ یہ اس عقیدہ کے خلاف ہے جو لوکا کی انجیل میں درج ہے کہ ہمارا لارڈ صحیح معنوں میں انسان یا بشر کامل تھا۔

۲۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ہمارا لارڈ (ناقابلِ فہم طریق سے) علم کی اس نوعیت سے بہرہ مند ہونے کی صلاحیت رکھتا تھا جو خدا کے ساتھ مخصوص ہے لیکن انسان کے روپ میں جلوہ گر ہونے کی وجہ سے وہ پوری طرح علم کی اس نوعیت کا اظہار نہ کر سکا۔ یہ دراصل اناجیل میں ان مختلف فقرات کی تطبیق و توافق کی ایک شکل ہے جن میں کہیں اس کی الوہیت کی طرف اشارہ ہے اور کہیں اس کی بشریت کی طرف۔

۳۔ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ حدودِ تجسیم میں داخل ہونے کے معنی بشری تجربہ سے دوچار ہونے کے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ مسیح جب تک بشری روپ میں ہے اس وقت تک وہ جسم و روح اور فکر و نفسیات کے اعتبار سے بشر ہی ہے[1]

یہ انداز فکر تو اس دور کے عیسائی متکلمین کا ہے خود قدیم عیسائی متکلمین بھی تجسیم اور تثلیث کو مان کر مسیح کے بارے میں یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ عالمِ لاہوت میں ان کا مقام کیا ہے اور تجسیم اپنے جلو میں خدائی کے کن پہلوؤں کو لیے ہوئے ہے جسٹن (Justin) کی یہ رائے ہے کہ تجسیم کے یہ معنی ہیں کہ مسیح

---

[1] اے نیو کومینٹری آن ہولی بائبل ۔ مطبوعہ لندن [illegible]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی ذات میں عقل و خرد مرکوز ہوگئی ہے اور اس میں وہ مسیح کو منفرد نہیں مانتا بلکہ عقل و خرد کے اس ارتقاء کو سقراط، افلاطون اور ہیراکلیس میں بھی تسلیم کرتا ہے کیونکہ اسکا یہ عقیدہ ہے کہ کلمہ (Logos) کا مسکن و محل بفرق مراتب ہر شخص کا ذہن ہے۔

اسکندریہ کے مدرسہ فکر کے بہت بڑے نقیب کلیمنٹ (Clement) کا کہنا ہے کہ مبدأ اول زمان و مکان سے بالا و منزہ ہے، اس کا کوئی حقیقی نام نہیں، یہ تعداد و عدد سے بھی پاک ہے .... انسان اپنی نیکی کی وجہ سے بیٹے (یعنی مسیح) کی طرح ہو سکتا ہے لیکن خدا نہیں ہو سکتا۔ کلیمنٹ کے نزدیک بیٹے اور باپ میں فرق ہے، بیٹا کلمہ کی تجسیم ہے اور باپ بیٹے سے بہر حال بڑا ہے۔ اسی اسکندری فلسفہ کے دوسرے عظیم شارح آریگن (Origen) ہیں، ان کا کہنا ہے کہ باپ سر چشمہ وجود اور خالص روح ہے اور بیٹا اگرچہ خدائی صفات رکھتا ہے مگر خدا ہرگز نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ اس بات کو جائز نہیں سمجھتا کہ براہ راست مسیح کے آگے دست دعا دراز کیا جائے دعا اس کے نزدیک صرف خدا سے مانگنی چاہیے

غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یوحنا کے ابہام اور پال کی تصریحات سے کلیسا نے جو مسیح کی الوہیت کا عقیدہ گڑھا وہ محض علم و فضل کا تصنع ہے، ورنہ کلمہ، روح اور بیٹے کا لفظ محض تعبیر و تشریح کا ایک انداز ہے جس میں اس دور کے ذہنی و فکری پس منظر کی جھلک نمایاں ہے اور اس پس منظر کا تانا بانا کئی عوامل سے تیار ہوا ہے، جن میں ایک عیسائیت کا رومی علم الاصنام سے آشنا ہونا ہے اور دوسرا اس میں ان پڑھے لکھے یہودیوں کا داخلہ ہے جو فلو کے حکیمانہ افکار سے متاثر تھے اور چاہتے تھے کہ عیسائیت کی تعبیر ان افکار کی روشنی میں کی جائے۔ تیسرا عامل بائیبل کی ذو معنی زبان اور محاورات ہیں، ان سب عوامل نے مل جل کر تثلیث و تجسیم کا مرقع تیار کیا اور ماحول کی مجبوریوں کو مدنظر رکھ کر اگر ان تصورات کا تجزیہ کیا جائے جو کلیسا کی روایتی ٹکسال سے ڈھل کر نکلے ہیں تو اسکا مطلب اس سے زیادہ سمجھ میں نہیں آتا کہ حضرت مسیح کے عقیدت مند ان کو بائیبل میں مذکورہ انبیا کے مقابلہ میں زیادہ اونچا، زیادہ بلند اور کامل دیکھنے کے آرزو مند ہیں اور کیوں نہ ہو جب یہودی روایات میں نبوت و رسالت کا منصب عظیم محض قومی تنگ نظری کا مظہر بن جائے اور پیغمبر کا مصرف صرف یہ رہ جائے کہ فلسطین کی بازیابی کی پیش گوئی کرے تو پھر ضروری ہو جاتا ہے کہ اس لفظ کے لیے ایسے اطلاق کی تلاش کی جائے جو نسبتاً وسیع و عالمگیر ہو اور اس لائق ہو کہ انسانیت اس سے سکون حاصل کر سکے۔

© rasailojaraid.com